R. No. 2100/57 Regd. No. L-727

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

جلد ۲۴ ۔ شمارہ ۲۷	ایڈیٹر: آل احمد سرور	۱۵ر جولائی ۱۹۶۵ء

اداریہ

بُنیادی کاموں پر زیادہ توجہ کیجیے

جب مرغن کھانوں اور مسالے دار سالنوں کی عادت پڑ جاتی ہے تو منہ کا مزا بگڑ جاتا ہے اور صحت بخش اور سادہ غذا پسند نہیں آتی۔ اسی طرح جب جلسوں اور کانفرنسوں، شاندار قرار دادوں اور دھواں دھار تقریروں کو لوگ سب کچھ سمجھنے لگتے ہیں تو ٹھوس کاموں کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی۔ ہم جلسوں اور کانفرنسوں کے خلاف نہیں ہیں۔ ہم عوام سے مضبوط رشتہ رکھنے کے پرجوش حامی ہیں۔ ہم یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اردو دوست، عوام کو اردو کی بقا اور ترقی کی ضرورت سے آگاہ کریں اور اس سلسلے میں مختلف مذاہب اور مختلف سیاسی خیالات کے لوگوں کو اپنا ہمدرد بنائیں مگر یہ کام اسی وقت مفید ہوگا جب ہمارا بنیادی کام بھی جاری رہے۔ یہ کام ابتدائی تعلیم کی منزل پر زیادہ سے زیادہ ایسے مدرسے کھولنا یا کھلوانا ہے جن میں اردو ذریعہ تعلیم ہو اور ثانوی تعلیم کی منزل پر تیسری زبان کی حیثیت سے اردو کی تعلیم کا انتظام کرانا ہے۔ ان دونوں کاموں میں مقامی طور پر جد و جہد سے خاصی کامیابی ہو سکتی ہے، لیکن اس معاملے میں ہمیں وہ جوش و خروش نظر نہیں آتا جو ضروری ہے۔ اتر پردیش میں ابتدائی تعلیم کم سے کم آٹھ دس لاکھ بچوں کو ملنی چاہیے تھی۔ مل صرف ڈیڑھ لاکھ کو رہی ہے۔ بہار میں چونکہ اردو دوستوں نے اپنی کوشش سے بہت سے مدرسے کھلوائے ہیں، اس لیے وہاں اردو کی پوزیشن زیادہ مضبوط ہے۔ ثانوی منزل پر بھی وہاں ایسے مدرسے کافی تعداد میں موجود ہیں جن میں اردو ذریعہ تعلیم ہے، جب کہ اتر پردیش میں شاید ایسے مدرسے دو چار سے زیادہ نہ ہوں۔ بہار میں اردو ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے لینے کے لیے اب بھی سہولتیں اتر پردیش سے بہت زیادہ ہیں۔ ہمیں اس لیے اتر پردیش میں اور ان تمام ریاستوں میں جہاں اردو دوستوں کی معقول تعداد ہے، ابتدائی تعلیم اردو کے ذریعے دینے کے لیے بڑے پیمانے پر جد و جہد کرنا ہے ہمیں

اردو کو علاقائی یا سرکاری زبان کا درجہ بھی دلوانا ہے اور اس کا مطالبہ ہم برابر کرتے رہیں گے لیکن مطالبے کو اس وقت تقویت ملے گی اگر ابتدائی منزل پر دس لاکھ طالب علم ہوں اور ثانوی منزل پر کم سے کم پانچ لاکھ۔ اس وقت ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ یونیورسٹی کی منزل پر کم از کم دس پندرہ ہزار طالب علم اردو لیں گے۔ اردو کی تعلیم کا مسئلہ بنیادی مسئلہ ہے اور اس کے لیے ایک طرف حکومت سے سہولتیں حاصل کرنا ہیں اور دوسری طرف خود ایسے مدرسوں کا انتظام کرنا ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ کچھ لیڈر یا کچھ سیاسی رہنما جلسوں میں اردو کے متعلق اچھی اچھی باتیں کہہ دیں گے، مگر ان سے ہمیں زیادہ مدد نہ ملے گی۔ ہماری طاقت وہ تعداد ہوگی جو اردو پڑھنے والوں کی ہوگی اور ان کے لیے زندگی کے ہر شعبے میں گنجائش بھی ہمیں ہی نکالنی پڑے گی اور اکثریت اور حکومت کو بھی اس طرح بتانا پڑے گا کہ ان کے لیے جگہ نکالنا، قومی مفاد کے لیے کس قدر ضروری ہے۔

اس شمارے میں

سیر بین

لیجیے صاحب ہندی کی کچھ اصطلاحیں دیکھتے دیکھتے لوٹنے لگیں۔ اتر پردیش میں کلکٹر ضلع کو ضلع ادھیش اور سب ڈویژنل مجسٹریٹ کو پرگنہ ادھیش کہا جانے لگا تھا۔ اب بقول "بلٹز" حکومت نے حکم جاری کیا ہے کہ ان کی جگہ ضلع مجسٹریٹ اور پرگنہ مجسٹریٹ لکھا جائے۔ خیر لوگوں کو تو اب سہولت ہو گئی، مگر پرانی مہروں کی جگہ نئی مہریں بنانے میں تقریباً ایک لاکھ روپے کا خرچ ہو جائے گا۔

بات یہ ہے کہ زبان پنڈت مولوی یا سرکاری افسر نہیں بناتے ہیں اور بالآخر وہی لفظ چلتا ہے جو عام فہم ہوتا ہے۔ حکومت اتر پردیش نے اس معاملے میں چلن کا لحاظ کیا ہوتا تو نہ صرف بہت سی غلطیوں سے بچ جاتی بلکہ بہت بڑی رقم بھی اس طرح برباد نہ ہوتی۔ وہ اصطلاحیں کس کام کی جو دو چار سال بھی نہ چل سکیں۔

ایک زمانے میں اردو والوں میں بھی یہ مرض تھا کہ خواہ مخواہ سیدھے سادے عام فہم الفاظ چھوڑ کر عربی، فارسی کے پہاڑ لڑھکاتے تھے۔ لنچ کا ترجمہ ظہرانہ، ایٹ ہوم یا جائے کا عصرانہ، ڈنر کا عشائیہ۔ حیدرآباد میں ۱۹۴۴ء میں راقم الحروف نے پھلوں کی ایک دوکان پر ایک سائن بورڈ دیکھا "مخزن الثمرات" اسی دن اس کا ماتھا ٹھنکا تھا کہ یہ روش اردو کو لے ڈوبے گی۔ حیدرآباد میں اردو کی مقبولیت اس وجہ سے آج بھی ہے کہ صدیوں کے چلن نے اسے سب کی زبان بنا دیا تھا، ہاں یہ مقبولیت اور زیادہ ہوتی اگر خواہ مخواہ عربی فارسی کے مشکل الفاظ استعمال نہ کیے جاتے۔ اچھی زبان وہ ہوتی ہے جو آسان ہو اور عام فہم۔ کتابی زبان اور بول چال کی زبان میں فرق ہے۔

اردو بول چال میں عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی، انگریزی سب کے لفظ آتے ہیں، سب کی گنجائش ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ہندی کی کثرت سے اسے ہندی بنا دیا جائے یا انگریزی کے الفاظ جا و بے جا استعمال کیے جائیں۔ اس معاملے میں نئی نسل خاصی بے پروا ہے، "مجھے واک کو جانا ہے۔" "اس معاملے میں آپ کو کوئی OBG'ECTION (آب جکیشن) تو نہیں ہے" ایسے جملے اکثر سننے میں آتے ہیں۔ انگریزی یا ہندی یا عربی کے الفاظ جن کے مترادفات اردو میں نہیں ہیں ضرور استعمال کرنے چاہئیں، مگر زبان کی فطرت اور مزاج کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر کی کتاب "فن کی جانچ"

حیدرآباد۔ ممتاز نقاد اور ادیبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر صاحبہ کے بارہ منتخب تنقیدی اور علمی مضامین کا مجموعہ "فن کی جانچ" ۱۱ جون ۶۵ء میں اشاعت پذیر ہو گیا۔ پروفیسر سید احتشام حسین صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی نے اس کا مقدمہ تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر کی اس سے قبل ایک اہم تالیف "من سمجھاون" ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے چھپ چکی ہے جس پر ریاستی کمیٹی برائے ترویج و اشاعت زبان اردو کی طرف سے پانچ سو روپے کا گرانقدر انعام ملا ہے اور اسے ریاست کی اہم تازہ مطبوعات میں شمار کیا گیا ہے۔ (ع۔ خ)

نقطۂ نظر

عبدالمغنی کے تنقیدی مقالات کا مجموعہ

چند مندرجات:۔ اقبال اور شخصیتیں، اردو خطوط نگاری میں ابوالکلام کا مرتبہ، افسانے میں تکنیک، کلیم الدین احمد کی ناقدانہ حیثیت، اقبال کا فن، موازنۂ اقبال و غالب، احتشام حسین کی تنقید نگاری، جگر کی شاعری، اقبال کی فارسی شاعری وغیرہ۔ قیمت ۵ روپے ۵۰ پیسے، ضخامت ۲۱۲۔ پتہ کتاب منزل۔ سبزی باغ، پٹنہ ۴

کراچی میں مولانا حامد حسن قادری کی برسی

۵ جون اور ۶ جون ۶۵ء کو اردو کے مشہور نقاد اور ادیب مولانا پروفیسر حامد حسن قادری کی پہلی برسی منائی گئی۔

اس موقع پر ۵ جون کو نیشنل کالج میں قادری اکاڈمی، اردو اکاڈمی سندھ، ادبی تعلیمی اکاڈمی اور نیشنل کالج کی جانب سے ایک ادبی اجتماع ہوا جس کی صدارت جناب ضیاء الدین احمد برنی نے فرمائی۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صدر شعبہ اردو، ڈاکٹر سید محمد یوسف صدر شعبہ عربی، جناب ابوالخیر کشفی استاد شعبہ اردو جامعہ کراچی اور جناب سید محمد تقی مدیر جنگ اور جناب حسین احمد خاں جمشید نے مقالات پڑھے۔ جناب ابوالبرکات نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ مغیث الدین فریدی استاد شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کی نظم خراج عقیدت سنائی گئی۔ آخر میں جناب صدر نے اجتماع سے خطاب کیا اور اس کے بعد مولانا قادری کی ایک تقریر کا ٹیپ سنایا گیا۔

۶ جون کو مولانا کے مزار پر ۲ بجے سے ۵ بجے تک قرآن خوانی ہوئی جس میں بہت سے اہل علم و فن نے شرکت کی۔

برسی کے موقع پر کراچی کے روزناموں جنگ، انجام اور حریت نے خصوصی مضامین اور مولانا قادری کے غیر مطبوعہ مضامین شائع کیے۔ (نامہ نگار)

عبدالغنی

مسئلۂ اردو کے دو رُخ

آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو کا مسئلہ اتنا پیچیدہ ہو گیا ہے کہ اب اس پر سوچ بچار کرنے میں تکلف اور تامل محسوس ہوتا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ اس مسئلے میں افراط و تفریط کو روز بروز زیادہ سے زیادہ دخل ہوتا چلا جا رہا ہے اور توازن کی کمی اسی تناسب سے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو اب تک ہندوستان میں اردو زبان و ادب کے فروغ و اقتدار کا خواب دیکھ رہے ہیں حالانکہ یہاں اس زبان اردو کا وجود ہی ہر صبح مشکوک سے مشکوک تر ہوتا چلا جا رہا ہے اور بہ ظاہر احوال اس بات کا کوئی یقین نہیں کہ اس ملک میں آئندہ اردو کا چلن اس کی اپنی فطری شکل اور خط میں باقی رہے گا اور اس شکل و خط میں تحریر و تصنیف اور صحافت کا سلسلہ جاری رہے گا، لہٰذا اس وقت پہلا کام تحفظ اردو کی جدوجہد ہے۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اردو کے تحفظ کے لیے فقط اتنا کافی ہے کہ جلسے کر دیے جائیں، جلوس نکال دیے جائیں، تجویزیں پاس کر لی جائیں، بیانات اور احتجاجات سے فضا کو مرتعش کر دیا جائے اور اس طرح مسائل و مسائل کی الجھی ہوئی گتھی کو چند لمحوں میں سلجھا دیا جائے، حالانکہ پیچیدہ مسائل اتنا جلد حل نہیں ہوا کرتے، ان کے حل کے لیے بعض وقت کئی نسلوں تک منظم تحریک چلانی پڑتی ہے اور مسئلے کو سال با سال خلوص اور ٹھوس تعمیری کوششوں سے اس کی بنیادوں کے ساتھ قائم و قوی رکھنا پڑتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں قسم کے لوگ اپنے افکار و اعمال میں بالعموم مخلص ہیں اور اپنے اپنے موقف کے لیے ان کے پاس کچھ نہ کچھ دلیلیں بھی ہیں اور غالباً وہ اپنے اپنے دائروں میں کچھ نہ کچھ کام بھی کر رہے ہیں لیکن ان کے ذاتی احوال اور اس سے زیادہ اجتماعی حالات نے انھیں مغالطے میں ڈال دیا ہے اور وہ مسئلے کو اس کی بنیادوں کے ساتھ دور تک اور دیر تک کے لیے نہیں دیکھ پا رہے ہیں، ورنہ ان کو یہ سمجھ لینے میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی کہ اردو کا مسئلہ آج اور آنے والے کل کے ہندوستان میں نہ فقط علمی ہے اور نہ محض سیاسی، بلکہ اس کی نوعیت بیک وقت دوگونہ ہے۔ ایک طرف تو اس کی علمی بنیاد اپنی جگہ ہے اور دوسری طرف اس کا عملی پہلو بھی آنکھیں دکھا رہا ہے۔ ہم نہ اس سے صرف نظر کر سکتے ہیں اور نہ اس سے، ہمیں بیک وقت اور یکساں طور پر مسئلے کے دونوں ہی رخوں کی نگہداشت کرنی ہوگی۔ یوں سمجھیے کہ مسئلے کا ایک رخ داخلی ہے اور دوسرا خارجی اور جب تک داخلی تقاضوں اور خارجی ضرورتوں، دونوں کی تکمیل نہیں ہو سکے گی نہ اس بات کی توقع ہے کہ اردو کا مسئلہ اس ملک میں حل ہوگا اور نہ اس بات کی امید کہ یہ مسئلہ بہت دنوں باقی بھی رہ سکے گا۔

سب سے پہلے مسئلۂ اردو کے عملی رخ کو لیجیے۔ عملی رخ سے میری مراد اس کا سیاسی و انتظامی رخ ہے جس کا تعلق زبان کے تحفظ اور اس کی بقا کے لیے ملکی اجتماعیات میں گنجائشوں سے ہے۔ اس سلسلے میں اب تک جو حرکات ہوئی ہیں ان کا عروج کانگریس کا منظور کردہ حالیہ منصوبہ ہے۔ چونکہ یہ منصوبہ آزادی ملک کے بعد اٹھارہ سال کی لسانی آویزشوں کا حل پیش کرنے کا مدعی ہے اور پچھلے بہت سارے منصوبوں کی ترقی یافتہ شکل ہے، اس لیے اب اس ملک کے ہر صاحب عقل کو سمجھ لینا چاہیے کہ ہندوستان کی موجودہ قیادت کے عزائم کیا ہیں۔ اردو کے سلسلے میں، اب تک اقتدار وقت نے کسی نہ کسی ابہام کے ذریعے لوگوں کو مبتلائے فریب رکھا تھا، مگر اب بلی تھیلے کے باہر آ چکی ہے اور کسی خوش گمانی کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔ ہندوستان میں شروع سے لسانی مسئلے کی نوعیت یہ رہی ہے کہ ہندی کے مقابلے میں دوسری ملکی زبانوں کی دستوری حیثیت کیا ہوتی ہے، چنانچہ اردو کے علاوہ زبانوں کے پرستار اپنی اپنی زبانوں کی حیثیت متعین کرنے کے لیے ہر موقع پر تدبر اور جاں فشانی کا ثبوت دیتے رہے۔ لہٰذا مذکورہ لسانی منصوبے میں ہندی کے غلبے کو برقرار رکھتے ہوئے بھی اردو کے علاوہ زبانوں کے حقوق کی کافی رعایت کی گئی ہے۔ مگر ان زبانوں کے اصحاب الرائے اس رعایت سے بھی اپنے عدم اطمینان بلکہ صریح بے زاری کا اظہار کر رہے ہیں، اس لیے کہ بہرحال ہندی کے سامان تفوق میں انھیں اپنی زبانوں کی بربادی کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ لیکن اہل اردو کی دل جوئی کے لیے تو اتنی سی رعایت بلکہ ایک ذرا سی رعایت کا کوئی شائبہ بھی مذکورہ منصوبے میں نہیں پایا جاتا۔ ذرا غور کیجیے، اس منصوبے کے دو پہلو ہیں، ایک انتظامی دوسرا تعلیمی۔ انتظامی سطح پر تجویز یہ ہے کہ ہندی اور انگریزی کے ساتھ علاقائی زبانوں کو بھی استعمال کیا جائے، اور اردو اب تک ہندوستان کے کسی علاقے کی زبان قرار نہیں دی جا سکی ہے، لہٰذا ظاہر ہے کہ انتظامی معاملات سے اردو قطعاً بے دخل رہے گی، یعنی علاقائی سطح تک دائرے میں بھی اردو کے لیے کوئی گنجائش نہیں، وہ حسب سابق میدان عمل سے غیر حاضر اور اس طرح بے مصرف رکھی جائے گی، یہاں تک کہ ناکارہ ہو کر اپنی موت آپ مر جائے، یعنی اس کو نہ بچائے کوئی، کسی کے دامن پر اس کے قتل کا الزام عاید ہو، وہ خودکشی کی مرتکب ہو کر رسوائے زمانہ ہو۔ اور تعلیمی سطح پر سہ لسانی فارمولے میں اردو کے لیے جو تھوڑی سی کاغذی گنجائش کم از کم دعوے کی حد تک ہی ہوتی تھی اس کو بھی ختم کر کے معاملے کو بالکل صاف کر دیا گیا، اب ہندی اور انگریزی کے ساتھ ایک جدید ہندوستانی زبان کا بھی کوئی مرحلہ نہیں رہنے دیا گیا۔ اس طرح اردو پر تعلیمی دروازے بھی مستقبل کے ساتھ بند کر دیے گئے تاکہ تعلیمی گوشوں میں بھی اس بیچاری کے بے حیثیت وقت گزارنے کا کوئی امکان نہ رہ جائے۔

یہ ایک نہایت افسوسناک اور انتہائی تشویش انگیز صورت حال ہے لیکن نہ تو ناقابلِ فہم ہے اور نہ غیر فطری۔ عصرِ حاضر کی جمہوری سیاست تنازع للبقا اور بقائے اصلح کے اصولوں پر مبنی ہے۔ اردو کے لیے ریاستی سطح پر انتظامی و تعلیمی دائروں میں سہولتوں کا حصول ایک خالص سیاسی مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے اسی وقت ایک مکمل سیاسی مہم چلانی تھی جب ۱۹۵۰ء میں ہندوستان کا دستور نافذ ہو رہا تھا اور عبدالحق راجندر پیکٹ اور گاندھی جی کی یقین دہانیوں کے بالکل خلاف اس میں اردو کی صریح حق تلفی کی گئی تھی۔ فقط ایک ووٹ کے سہارے کانگریس نے اہلِ اردو سے کیے گئے تمام وعدوں کو پسِ پشت ڈال دیا تھا اور اس طرح اردو کے تاریک مستقبل کے اشارے دے دیے تھے۔ لیکن ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۵ء تک پندرہ سال کا عرصہ شور و شغب یا زیادہ سے زیادہ عرض داشت میں گزار دیا گیا، اور اب بھی ہماری تحریک مظاہروں اور بیانوں سے ایک قدم آگے نہیں بڑھی ہے۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ہم لوگ دستوری طور پر ایک جمہوریت میں زندگی بسر کر رہے ہیں، اور جمہوریت کا سارا کارخانہ پارلیمانی سیاست کی بنیاد پر چلتا ہے، اور پارلیمانی سیاست منحصر ہے رائے عامہ پر، اور رائے عامہ کا مطلب اس سیاست میں ہوتا ہے کہ کسی مسئلے پر ملک کا ایک معتد بہ طبقہ اس طرح بیدار اور منظم اور سرگرم ہو کہ وہ اس مسئلے کو دنیا کا اہم ترین قرار دے کر اس کے لیے ہر قسم کی قربانی کرنے کے لیے آمادہ ہو، اس وقت وہ اپنا حق قرار دے اور پارلیمانی سیاست کے تمام شہسواروں کو صلائے عام دے دے کہ ان سب لوگوں سے اس کے اتفاق اور اختلاف کا معیار اسی حق کے متعلق ان کا رویہ ہے۔ اس کے بعد اس حق کو ثابت کرنے کے لیے اپنے خون اور پسینے کے سارے قطرے نچوڑ دے۔ اہلِ اردو نے اپنی مادری و تہذیبی زبان کے لیے اس طرح کی کسی تدبیر اور تدبیر سے کبھی کام نہ لیا۔ اس بے شعوری اور بے عملی کے نتائج آج ہمارے سروں پر لٹک رہے ہیں، اور ابھی ان کی خطرناکی میں اور اضافہ ہوگا اگر ہم اپنی پچھلی روش پر قائم رہے۔ اس میں شک نہیں کہ حالات کے جبر نے اس وقت اہلِ اردو کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور ان کے اعصاب سخت مشتعل ہیں، وہ سراپا داد و فغاں ہیں، مگر اشتعال و فریاد بجائے خود کوئی وزن نہیں رکھتے تا وقتیکہ ان کے پیچھے ایک مدبرانہ تنظیم اور سرفروشانہ تحریک نہ ہو۔

اب مسئلے کے علمی رخ کو لیجیے۔ آج اردو کا مسئلہ جو کچھ ہے اور آئندہ جو کچھ وہ ہو سکے گا، وہ ظاہر ہے کہ اسی بات پر منحصر ہے کہ اس ملک میں اردو نام کی کوئی زبان جاری بھی رہے، اردو پڑھنے والے ہوں، اردو پڑھانے والے ہوں، اردو میں ہر قسم کا کام کرنے والے ہوں۔ اور یہ باتیں ہنگامی قسم کی نہیں، یہ ایک زبان کی مستقل قدریں ہیں، ان کی پرورش میں سیاست سے زیادہ تعمیر کو اور مظاہرہ و احتجاج سے زیادہ تعمیر اور شعور کو دخل ہے۔ یہ سب تعمیری اور داخلی کام ہیں، جنہیں خالص زبان کے جاننے اور ماننے والوں ہی کو اپنے درمیان اور اپنے وسائل سے انجام دینا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کسی اجتماعیت میں زبان کے مقام کا اثر ان تعمیری و داخلی کاموں پر بھی کچھ نہ کچھ ضرور پڑتا ہے، مگر یہ کام سراسر اجتماعی مراعات کے محتاج نہیں، ان کے بغیر بھی انجام پذیر ہو سکتے ہیں، اور ہوتے رہے ہیں۔ اردو کی ابتداء کو چھوڑ دیجیے جب اسے لال قلعے میں کوئی منصب نہیں حاصل تھا، بلکہ غریب بازاروں میں پل رہی تھی، اس لیے کہ قدرتی زبانوں کی ابتدا اسی طرح ہوا کرتی ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں جو زبان گڑھی گئی تھی، دانشمند حاشا ہونے کے باوجود آج تک داستان کچہری میں اپنی جڑیں نہیں اتار سکی۔ اس تاریخی واقعے پر غور کیجیے کہ انگریزوں کے ڈیڑھ سو سالہ دورِ اقتدار میں اردو کو کتنے دن تخت پر بیٹھنا نصیب ہوا؟ اس پورے عہد میں اردو کی تعلیم و تصنیف کا کام بالعموم سرکاری اداروں سے باہر ہی یا پھر اہلِ اردو کے گھروں اور پرائیویٹ اجتماعی اداروں میں ہوتا رہا۔ زمانے کے دباؤ کے خلاف اس پورے دورِ ابتلا میں اردو والے اپنی تہذیب اور تہذیبی زبان کے تحفظ و ارتقا کے لیے ایک سے ایک ادارے قائم کرتے اور چلاتے رہے، جن میں سے اکثر آج بھی نئے زمانے کے جور و جفا کے باوجود کسی نہ کسی انداز میں چلے جا رہے ہیں۔ لیکن اب یہ قدیم ادارے خاص کر اپنی موجودہ حالت میں اردو اور اس کے کلچر کے تحفظ کے لیے کافی نہیں۔ اب معاملات اتنے وسیع اور پیچیدہ ہو گئے ہیں، پھر نئے زمانے کے نئے تقاضے بھی سر پر اس طرح سوار ہیں کہ ایک طرف پرانے اداروں کو نیا رنگ دینا ہوگا، اور دوسری طرف کچھ نئے ادارے بھی بروئے عمل لانے ہوں گے۔ اور اس تعمیر و تجدید میں ایک بنیادی نکتہ ضرور پیش نظر رکھنا ہوگا، وہ یہ کہ اردو زبان خلا میں آوارہ نہیں، یہ ایک تہذیب سے وابستہ ہے اور اس کا ایک تہذیبی حلقہ ہے، ایک اجتماعی طبقہ۔ لہٰذا اردو کی بقا و ترقی کے لیے کوئی کوشش اسی وقت موثر ہو سکتی اور استحکام حاصل کر سکتی ہے جب اس کا مطمح نظر اردو کلچر کی خدمت ہو اور اسے اردو کمیونٹی کا اعتماد و تعاون پورے طور پر حاصل ہو، ورنہ ساری محنتیں برباد، زبان اور اس کی توانائیاں فضا میں تحلیل ہو کر رہ جائیں گی۔ ہم نے برطانوی عہد میں اپنی زبان کا تحفظ اسی اجتماعی اور تہذیبی انداز میں کیا تھا اور کانگریسی عہد بھی اپنی قہرمانیوں سے ہمیں اسی آزمودہ نسخے کی دعوت دے رہا ہے۔ اس سلسلے میں دو اصولی باتیں ہمیشہ ملحوظ رکھنی چاہئیں، اول یہ کہ اردو ایک تہذیب کی علامت ہے، جس سے الگ اس کا کوئی وجود متصور نہیں، دوم یہ کہ آزادی کے بعد بھی اس تہذیب کو امن و استقلال نصیب نہیں ہوا ہے، یہ ہنوز معرضِ خطر میں ہے اور اس کو دوسری تہذیبوں میں ضم کر کے اس کی انفرادیت کو ختم کر ڈالنے کی سازشیں جاری ہیں۔

بہر حال داخلی طور پر اس وقت اردو کے لیے سب سے اہم

(باقی صفحہ ۱۴)

چند محروم

رباعیات

تہذیبِ وطن کی ترجماں ہے اردو
سرمایۂ فن کی پاسباں ہے اردو
ناشر اس کی لطافتوں پر ہیں نثار
محبوبِ دلِ سخنوراں ہے اردو

کرتے ہیں جو لوگ دشمنی اردو سے
بے جا ہے ان کی بدظنی اردو سے
اس ملک میں یوں تو بیسیوں ہیں فرقے
اک "قوم" اگر بنی، بنی اردو سے

ہندی کو ہم بھی مرحبا کہتے ہیں
لیکن اک بات برملا کہتے ہیں
دیکھو تو ذرا ستم ظریفی ان کی
اردو کو جو اردو نہیں ہندا کہتے ہیں

چلینگو جمنا میں رہی اردو کی بیاض
ہوتی ہے اسے دیکھ کے ہندی ناراض
اردو کا بھرم ہی رہ گیا، جب ہو
نہرو کے مقلدوں کو اس سے اعراض

شور واحدی

غزل

رہ جنون و خرد تم نے روک رکھی ہے
نگاہ بھی مہ و انجم نے روک رکھی ہے
کبھی کی ڈوب گئی ہوتی عشق کی کشتی
یہ ناؤ دل کے تلاطم نے روک رکھی ہے
ہزاروں بار خزاں آئی اور گئی ناکام
بہار تیرے تبسم نے روک رکھی ہے
ہنسی لبوں پہ اور آنکھوں میں شوق کی برسات
کبھی تو ہم نے کبھی تم نے روک رکھی ہے
زمیں پہ لالۂ و گل بن چکا فضا میں چمک
جگہ تری مہ و انجم نے روک رکھی ہے
زبانِ شکوہ مری اے جمالِ غنچہ لباں
ترے حسین تکلم نے روک رکھی ہے
فلک پہ چاند ستارے ٹھہر گئے ہیں شور
یہ رات میرے ترنم نے روک رکھی ہے

اردو غزل "عالمی ادبیات میں اہمیت رکھتی ہے"

پروفیسر رسل کا اظہار خیال

لکھنؤ ۱۵ر جون۔ لندن یونی ورسٹی کے شعبہ اردو کے ریڈر پروفیسر رالف رسل نے آج یہاں خیال ظاہر کیا کہ اردو غزل نہ صرف یہ کہ اردو ادب کی بہترین صنف ہے بلکہ عالمی ادبیات میں اس کو اہمیت حاصل ہے۔

پروفیسر رسل نے جو آج صبح یوپی پریس کلب میں مقامی ادیبوں اور طالب علموں کے ایک اجتماع کو جو انجمن ترقی ادب کے زیر اہتمام ہوا تھا خطاب کر رہے تھے اردو ادب کے مستقبل کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے افسوس کے ساتھ کہا کہ اردو کے بہی خواہ جب تک دنیا کی بڑی زبانوں میں اردو ادب کے ترجمے کر کے اسے وسیع پیمانے پر روشناس نہ کرائیں گے اردو کا مستقبل روشن نہیں کہا جا سکے گا۔

انھوں نے زور دیا کہ میرؔ، غالبؔ، سوداؔ اور دوسرے کلاسیکی شعرا کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنا بہت بڑی خدمت ہے۔

دوران گفتگو میں انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ اردو داستانوں نے اردو ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔

انھوں نے کہا "اردو نقادوں کی یہ غلطی ہے کہ وہ موجودہ اردو ناول کا رشتہ مغرب کے ادب سے جوڑتے ہیں حالانکہ اردو ناول، اردو داستانوں کا ترقی یافتہ اقدام ہے۔"

اس سلسلے میں پروفیسر رسل نے اردو نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد (پٹنہ) اور مسٹر راز یزدانی کا حوالہ دیا جنھوں نے اردو داستانوں اور اردو ناول کے باہمی رشتہ کو صحیح طور پر سمجھا۔ انھوں نے ڈپٹی نذیر احمد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے خیال ظاہر کیا کہ داستانوں سے ناول نگاری کی طرف آنے کی پہلی کوشش ڈپٹی صاحب ہی نے کی تھی۔

پروفیسر صاحب نے ایک استفسار پر اردو رسم خط سے اپنی دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے خیال ظاہر کیا کہ رسم خط کا معاملہ جذباتی اہمیت رکھتا ہے۔

بعض استفسارات کے جواب میں پروفیسر رسل نے بتایا کہ وہ غالبؔ کو سب سے بڑا اردو شاعر مانتے ہیں اور مرزا رسوا کی "امراؤ جان ادا" ناول انھیں سب سے زیادہ پسند ہے۔

اس اجتماع کی صدارت پروفیسر احتشام حسین نے کی انھوں نے اپنی تقریر میں پروفیسر رسل کی اردو خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ انجمن ترقی ادب کے صدر ابراہیم علوی نے آخر میں پروفیسر صاحب اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(قومی آواز)

امیر حسن نورانی

کاپی رائٹ

نئی ادبی تخلیقات کے حقوق مالکانہ

کاپی رائٹ کا مطلب یہ ہے کہ ادبی اور فنی تخلیقات کے مالکانہ حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ جس طرح مکانات، باغات وغیرہ کی ملکیت ہوتی ہے، اسی طرح علمی و ادبی تخلیقات کی حیثیت بھی املاک کی ہوتی ہے۔ لیکن جائداد کی حفاظت اور کتابوں کی حفاظت میں بڑا فرق ہے، اسی لیے دونوں کے تحفظ کے قوانین بھی یکساں نہیں ہیں۔ اگر آپ کے پاس ایک مکان یا باغ ہے تو آپ اس پر اپنی ملکیت ثابت کر سکتے ہیں، اور اس میں کوئی دشواری نہیں ہوتی، کیونکہ وہ مکان صرف ایک ہے اس جیسا دوسرا مکان نہیں ہے، مگر کتابوں کا معاملہ ہی دوسرا ہے۔ ایک کتاب چھپ جانے کے بعد ہزاروں کی تعداد میں ہو جاتی ہے اور سارے ملک میں یا دنیا بھر میں پھیل جاتی ہے، اس لیے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس کتاب کو کوئی دوسرا ناشر نہ چھاپ لے، کیونکہ ایسا کرنا دوسرے کی ملکیت پر ناجائز قبضہ کرنے کے مترادف ہے۔ جو ناشر کسی مصنف کی کتاب چھاپتا ہے، وہ اس کا معاوضہ ادا کرتا ہے، بلا اجازت چھاپنے والا ناشر مجرم ہوتا ہے وہ مصنف کو نقصان پہونچاتا ہے۔ اسی لیے ضروری ہوتا ہے کہ علمی و ادبی تخلیق کے مالکانہ حقوق خواہ ناشر کے ہوں یا مصنف کے ان کی حفاظت کی جائے، یہ حقوق گویا ایک قسم کی ملکیت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں کتابوں کے حقوق مالکانہ مصنف اور ناشر کے درمیان ایک قانونی معاہدے کے ذریعہ طے پاتے ہیں اور یہ قابل ترمیم بھی ہوتے ہیں، حکومت کی جانب سے اس سلسلے میں کاپی رائٹ ایکٹ موجود ہے جو مصنف، ناشر اور پڑھنے والوں کے حقوق کی نگرانی اور حفاظت کرتا ہے۔

کاپی رائٹ، مصنف اور ناشر میں تعلق کا ذریعہ ہے۔ دنیا کے ہر ملک نے اپنے ملک کی ضرورت کے مطابق کاپی رائٹ کے قوانین بنا رکھے ہیں، یونسکو کے ذریعہ سے کاپی رائٹ کے بین الاقوامی قوانین بھی بن گئے ہیں، جن پر بعض ممالک عمل درآمد کر رہے ہیں۔

حکومت برطانیہ نے کاپی رائٹ کا جو قانون وضع کیا تھا اس کا نفاذ دولت مشترکہ کے تمام ممالک میں ہوا ہے، اس میں مصنف کے حقوق کے تحفظ کی میعاد اس کی زندگی بھر رہتی ہے اور اس کے انتقال کے پچاس سال بعد باقی نہیں رہتی، پھر اس کو جو چاہے شائع کر سکتا ہے۔ اگر مصنف کی وفات کے ۲۵ سال بعد کوئی چھاپنا چاہے تو وہ پہلے اس شخص کو مطلع کرے جو ان حقوق کا وارث ہے اور شائع کرنے کے بعد بھی اس کو اطلاع دے۔ امریکہ میں اس کی مدت ۲۸ سال ہوتی ہے اور اس کی تجدید مزید ۲۸ سال کے لیے اور ہو سکتی ہے۔

کاپی رائٹ کا بین الاقوامی معاہدہ

۱۹۵۵ء میں یونسکو نے ایک عالمگیر معاہدۂ حقوقِ اشاعت کو عملی جامہ پہنایا، اور اس معاہدہ کو بہت سے ان ممالک نے تسلیم کر لیا جو یونسکو کے رکن ہیں۔ اس معاہدہ کی رو سے بھی ادبی تخلیق کے حقوقِ اشاعت کے تحفظ کی مدت ۲۵ سال رکھی گئی ہے اور یہ مدت پہلی اشاعت سے شمار کی جائے گی، اور بعض حالات میں مصنف کے انتقال کے دوسرے دن سے شمار کی جائے گی۔ اس طرح اس تخلیق کا ترجمہ بھی مصنف کی اجازت اور اس کو معاوضہ دیے بغیر نہیں کیا جا سکے گا۔ بعض ممالک نے اس معاہدہ پر دستخط کر دیے ہیں، اور اس پر عمل درآمد بھی شروع کر دیا ہے، بہت سے ممالک نے عمل درآمد شروع ہی نہیں کیا ہے، کیونکہ ایسا کرنے کے لیے انھیں اپنے ملک کی پارلیمنٹ سے ایک قانون پاس کرانا ضروری ہے۔

ہندوستان اور پاکستان میں کاپی رائٹ کا مسئلہ

پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں نے یونسکو کے معاہدہ کو تسلیم کر لیا ہے مگر اب تک دونوں ملکوں میں کاپی رائٹ کے اصولوں کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ مصنفین کو ناقابل تلافی نقصان پہونچ رہا ہے مگر دونوں حکومتوں نے کوئی عملی قدم اس کی روک تھام کے لیے نہیں اٹھایا۔ پاکستان میں ہندوستانی مصنفین اور ناشرین کی کتابیں بغیر اجازت، اور بلا معاوضہ شائع کی جا رہی ہیں، اور اسی طرح ہندوستان میں پاکستانی مصنفوں اور ناشروں کی مطبوعات کثرت سے یہاں کے ناشرین چھاپ رہے ہیں۔ اس سلسلے میں دونوں ملکوں کے ناشرین زیادہ خطاوار ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف انتقامی کارروائی کر رہے ہیں اور مصنف بیچارے خواہ مخواہ نقصان اٹھا رہے ہیں اور اس کے لیے وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ دونوں ملکوں کے سنجیدہ اور معیاری ناشرین نے اس کے خلاف اپنی اپنی حکومتوں سے معمولی احتجاج کیا مگر اب تک اس کی کوئی روک تھام نہیں ہو سکی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب جیسے ہی ایک ملک کی مطبوعہ کتاب دوسرے ملک میں پہونچتی ہے تو بیک وقت متعدد ناشر اس کو بعجلت تمام چھپوا کر شائع کر دیتے ہیں۔ ایسے مجرم ناشرین نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک پریشان کن حرکت اور شروع کی ہے، وہ یہ کہ اپنے ملک کی بعض ایسی مطبوعہ معیاری کتابوں کو جن کی مانگ زیادہ ہوتی ہے، چھاپ لیتے ہیں

اور ناشر کی جگہ اپنے نام کے بجائے دوسرے ملک کے کسی ناشر کا نام ڈال دیتے ہیں، اس طرح وہ اپنے کو قانونی گرفت سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اگر دونوں حکومتیں اس کے انسداد پر کمربستہ ہوں تو نہایت آسانی سے یہ فتنہ دبایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی کتاب "تاریخ ادب اردو" کو لیجیے۔ اس کتاب کا جائز ناشر جو رام کمار بکڈپو لکھنؤ ہے، پاکستان کی ایک فرم عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور نے اس کتاب کو نہایت بھونڈے طریقہ پر چھاپ دیا۔ اب دہلی کے ایک غیر معروف ناشر نے یہاں اس کتاب کا ایک ایڈیشن چھوٹے سائز میں معمولی کاغذ پر غیر مصور شائع کر دیا اور اس پر ناشر کی جگہ اپنے نام کے بجائے لاہور کے مذکورہ ناشر ہی کا نام ڈال دیا تاکہ گرفت نہ ہو سکے لیکن اگر حکومت تحقیق پر آمادہ ہو تو معاملہ نہایت آسان ہے۔ کاغذ کی قسم اور طباعت وغیرہ سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب ہندوستان میں بلکہ دہلی میں چھپی ہے۔ اسی طرح کی حرکتیں پاکستان میں بھی ہو رہی ہیں کچھ پتہ نہیں کہ یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔ ہمارے خیال میں اگر دونوں طرف کے ناشرین متحد ہو کر جدوجہد کریں تو بہرحال کامیابی ہو سکتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ہندوستان میں یہ سب جھگڑے صرف اردو کے سلسلے میں ہیں جس کے ناشر و مصنف عموماً کساد بازاری کا شکار ہیں۔ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مصنفین اور ناشرین اپنے اپنے حلقوں سے احتجاجی تجاویز پاس کر کے اپنی حکومت کو بھیجیں اور اس بات کا مطالبہ کریں کہ اس کے تدارک کی طرف فوراً توجہ کی جائے۔

صفحہ ۵ سے آگے

مسئلہ ابتدائی تعلیم کا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ تعلیم اب عام اور جبری ہو گئی ہے۔ ہر بچے کے لیے کسی تسلیم شدہ ادارے میں داخل ہو کر تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ یہ تسلیم شدہ ادارے بیشتر وہ ہیں جن میں اردو کی تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں اور نہ ہونے کی توقع ہے حالاں کہ پرائمری سطح پر مادری زبان کی تعلیم کا حق کاغذ پر تسلیم شدہ ہے۔ مگر کاغذ میں رنگ بھرنے والے ہاتھ ہمارے موافق نہیں۔

چناں چہ پرائمری سطح پر اردو کی تعلیم کا تحفظ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ دستور کی گنجائشوں سے فائدہ اٹھا کر ہم اپنے الگ تعلیمی یونٹ کھول کر انھیں محکمۂ تعلیم سے ضابطے کے مطابق منظور کرائیں۔ اسی طرح ثانوی، پھر اعلیٰ سطحوں پر ہمیں نظام تعلیم کو اپنے ہاتھوں میں لینا ہوگا۔ سہ لسانی فارمولا بجائے خود اپنی موجودہ شکل میں ہمارے کسی کام کا نہیں خاص کر جب اس کی تعمیل ان ہاتھوں میں ہو جو ہر حال سے اردو کو مات دینے پر تلے ہوئے ہوں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اس وقت اردو طبقہ اسی قسم کے حالات سے دوچار ہے جن میں سرسید نے اپنی تعلیمی تحریک شروع کی تھی، پھر شبلی اور مولانا قاسم نانوتوی نے اپنی تحریکیں چلائی تھیں۔ چناں چہ اس وقت بھی ہمیں اسی حوصلے، اور منصوبے اور سرگرمی کی ضرورت ہے جو سرسید، شبلی اور مولانا قاسم کے زمانے میں ہم نے دکھائی تھی۔ ہمیں بہر صورت اردو کی تعلیم کا، ابتدا سے انتہا تک، اپنے ذرائع سے بندوبست کرنا ہوگا۔

اور شبلی و سید و قاسم ہی کی طرح اپنے نظام تعلیم کو ایک نظام تصنیف اور نظام تہذیب سے بھی لازماً مربوط رکھنا پڑے گا۔ اہل اردو کے تہذیبی شعور کی تربیت کے لیے ہمیں رسالے چھاپنے اور کتابیں لکھنی ہوں گی۔ اس مقصد کے لیے ایک طرف مصنف اور صحافی پیدا کرنے ہوں گے، تو دوسری جانب حلقۂ قارئین کو وسیع سے وسیع تر کرنا ہوگا۔ پھر طباعتی طریقوں کو ترقی اور اشاعتی منصوبوں کو فروغ دینا ہوگا، اور ان مہمات کی سرانجامی کے لیے درم و دم اور قدم و سخن کے تمام وسائل کو سلیقے اور ایثار کے ساتھ ایک رخ پر لگانا ہوگا اور یہ سارے کام صرف اپنے ذہن و بازو کے بھروسے کرنے ہوں گے، دوسروں کی طرف دیکھے بغیر بلکہ بعض اوقات دوسروں سے صرف نظر کر کے۔

یہ جب ہندوستان میں مسئلۂ اردو کے دونوں رخوں کے خال و خط اور مسئلے کے حل کی کوئی کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک ان دونوں رخوں کے تمام خال و خط کو پوری طرح اور پورے تناسب و توازن کے ساتھ نہ سمجھ لیا جائے۔ اس مقصد کے لیے دو باتیں ضروری ہیں، اول نظری سطح پر یہ کہ مسئلے کے دونوں رخ الگ الگ خانوں میں بانٹنے کی بجائے انھیں ایک کل کے ناقابلِ تفریق اجزا اور باہم پیوستہ سمجھا جائے، دوم عملی سطح پر یہ کہ ایک مرکزی تنظیم بیک وقت دونوں رخوں پر ایک مربوط پالیسی اور پروگرام کے ساتھ کام کرنے والی ہو۔ یہ نقشہ اسی صورت میں بروئے عمل آسکتا ہے جب بے شعوری، بے تدبیری اور انتشار و بدنظمی کی وہ کیفیت ہمارے درمیان سے دور ہو جائے جو ادھر کچھ عرصے سے اردو ماحول پر طاری نظر آتی ہے۔

اگر میرا یہ تجزیۂ احوال صحیح ہے، تو میں تجویز کرتا ہوں کہ:-

(۱) انجمن ترقی اردو ہند، جلد از جلد ایک کل ہند کانفرنس بلائے۔

(۲) اس کانفرنس میں ایک دوسرے پر الزام و جواب الزام سے بالکل صرف نظر کر کے، صرف حقائق پر غور و فکر کیا جائے۔

(۳) اتفاق رائے سے ایک جامع تعلیمی اسکیم مرتب کی جائے۔

مراسلات

رسالہ تنویر الشرق کلکتہ

جنوری ۱۹۰۸ء سے انجمن مفید الاسلام کلکتہ نے تنویر الشرق کے نام سے ۱۸×۲۲/۸ کی تقطیع پر ادبی ماہنامہ جاری کیا۔ راقم الحروف کے پاس اس کے صرف آٹھ شمارے (جنوری، جون ۱۹۰۸ء تا اکتوبر دسمبر ۱۹۰۸ء) ہیں۔ ضخامت ۳۲ تا ۴۸ صفحات ہے۔

سرورق کی جدول میں معمولی سی شنگرفی نقاشی، اوپر کے داہنے گوشے میں ہلال اور ہشت نقاطی ستارہ ہے۔ سامنے سورج کی کرنوں کے بیچ میں تنویر الشرق لکھا ہے۔ مقام اشاعت نمبر ۲۱ پھول باغ روڈ۔ ڈاکخانہ انٹالی کلکتہ۔ مطبع رضوانی نمبر ۱۵۵ امام باڑہ لین کلکتہ میں چھپا۔ قیمت سالانہ مع محصول ڈاک عہ۔ قیمت فی پرچہ تین آنے ہے۔

ڈیٹر مولوی قاضی ابوالمظفر مولا بخش رضوانی تھے۔ مضمون نگار مشاہیر ادبا و شعرا، منشی نوبت رائے نظر لکھنوی، ذکاء اللہ دہلوی، علی سجاد دہلوی عظیم آبادی، یوسف قیصر بھوپالی، آغا رفیق بلند شہری، بدر الزماں بدر کلکتوی، شمس العلماء ہدایت حسین، گنگا رام لاہوری، شوکت میرٹھی، حیدر علی طباطبائی، شاد عظیم آبادی، آزاد عظیم آبادی، رنجور عظیم آبادی، شہرت عظیم آبادی، محمد علی شوق لکھنوی، امجد حسین شوق (ربیدہ، بستی)، لکھنوی، نادر کاکوروی وغیرہ ہم تھے۔

مضامین مختلف نوعیت کے ہیں، تاریخی، اخلاق، اقتصادی، تنقیدی، تفریحی، حیاتیاتی، ریاضیاتی، ڈراما، ناول، سوانح عمری، انشائیے، تراجم نثر و نظم وغیرہ۔ بعض مضامین کا سلسلہ کئی شماروں میں ختم ہوا ہے۔ غزلوں، مخمسوں، رباعیوں کے علاوہ ترکیب بند، مسمط اور نظمیں بھی ہیں۔ بعض نظموں میں ترتیب قوافی بطرز انگریزی ہے۔

شعرا اور مضمون نگار زبان و انداز بیان میں محتاط ہیں۔ بعض میں علمی سی رنگینی بھی ہے۔ تنقیدی مضامین اور مختصر افسانے عجیب ہیں۔

(یوسف تقی)

مدھیہ پردیش کے شعراء توجہ فرمائیں

انجمن ترقی اردو ساگر کے زیر اہتمام میں مدھیہ پردیش کے شعراء کا ایک تعارفی تذکرہ مرتب کر رہا ہوں لہٰذا شعراء کرام سے درخواست ہے کہ وہ اپنا نمونہ کلام مختصر حالات زندگی اور تصویر ارسال فرما کر ممنون فرمائیں۔

اگست ۱۹۷۵ء کے آخر ہفتہ سے کتابت کا کام شروع ہو جائے گا۔

(محمد حسین خاں مہر جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ساگر
عظیم اللہ خاں ہاؤس، ساگر۔ ایم۔ پی)

فرہنگ بہار

حال میں پروفیسر شاہ مقبول احمد صاحب کی کتاب "چند ادبی مسائل" شائع ہوئی ہے۔ اس کا ایک حصہ "بہار کے ٹھیٹھ محاورے" پر مشتمل ہے۔ بصد ادب عرض ہے کہ جناب پروفیسر صاحب موصوف نے اکثر و بیشتر وہ الفاظ، محاورات اور امثال درج کیے ہیں جو بہار سے باہر ٹکسالی زبان میں بھی رائج ہیں۔

اس سلسلے میں یہ عرض ہے کہ جناب پروفیسر یوسف تقی صاحب کی کتاب "فرہنگ بہار" (جس کا حوالہ رانچی کالج میگزین بابت اکتوبر ۱۹۵۷ء میں دیا ہوا ہے) زیادہ مکمل اور محقق ہے۔ جناب تقی صاحب نے الفاظ محاورات و امثال کا لسانیاتی تجزیہ کیا ہے۔ ٹکسالی زبان میں ان کے بدل دیے ہیں اور لغات سے مقابلہ کر کے مشترک الفاظ محاورات اور امثال کو خارج کر دیا ہے۔ نیز یہ بھی درج کر دیا ہے کہ یہ الفاظ بہار کے کس علاقے میں رائج ہیں۔

شاید خانگی پریشانیوں کے باعث اس کی طباعت اب تک نہیں ہو سکی ہے۔ ہم دعا گو ہیں کہ بفضلہٖ تعالیٰ جلد شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہو۔

(تقی احمد)

کڑپہ میں لاہوتی صاحب کی آمد

کڑپہ ۱۰ جون۔ مسٹر سری نواس لاہوتی صاحب نائب معتمد صوبائی انجمن ترقی اردو حیدرآباد کڑپہ تشریف لائے تھے۔ آپ کی آمد پر انجمن کی مجلس عاملہ کا جلسہ دفتر انجمن واقع چاند بیرا گنج میں طلب کیا گیا۔ جملہ ممبران و اراکین بہ شمول سرپرست انجمن جناب ایس۔ اے۔ ستار صاحب شریک جلسہ ہوئے۔ ممبران اور اراکین کے تعارف کے بعد معتمد انجمن جناب عبدالحکیم صاحب نے رپورٹ پیش کی۔ مسٹر لاہوتی صاحب نے انجمن کی کارروائی کا جائزہ لیتے ہوئے بہت سے مفید مشورے دیے۔ اور آخر میں ایک رزولیوشن کے ذریعے یہ طے پایا کہ علاقہ رائل سیما کی اردو تنظیم کو مدنظر رکھتے ہوئے اردو کے کام کو آگے بڑھانے کے سلسلے میں کڑپہ کو مرکز بنایا جائے۔ اسی روز شب کے دس بجے زیر اہتمام آزاد لائبریری ایک جلسۂ عام کا انعقاد عمل میں آیا جس میں شہر کڑپہ کے اردو داں عوام کثیر تعداد میں شریک رہے۔ مسٹر لاہوتی صاحب نے اس جلسے کو مخاطب کرتے ہوئے کئی غلط فہمیوں (اردو سے متعلق) کو دور کیا۔ حضرت ذکی اور حضرت ایس۔ اے۔ ستار صاحب نے بھی جلسے کو مخاطب کیا۔ جلسے کے فوراً بعد ایک طرحی مشاعرہ ہوا جس میں شہر کڑپہ کے نمائندہ شعرا نے اپنا کلام سنایا۔

(عبدالحکیم سکریٹری انجمن ترقی اردو۔ کڑپہ)

انجمن ترقی اردو بھوپال کے انتخابات

عہدیداران کا اعلان

اردو کے کاز کے لیے مل جل کر کام کرنا اور جوش برقرار رکھنا ہے (ایم۔ عرفان)

بھوپال بذریعۂ ڈاک (۵ جولائی) انجمن ترقی اردو بھوپال کے انتخابات مکمل ہو گئے ہیں جناب ایم۔ عرفان مدیر شعلۂ حیات بھوپال جنھیں صدر منتخب کیا جا چکا تھا۔ شہر بھوپال کی مجلس منتظمہ کی تکمیل ہوتے ہی عہدیداروں کا اعلان کر دیا ہے۔ اب اس اعلان کے بعد شہر بھوپال کی مجلس منتظمہ اس طرح رہے گی۔

۱۔ جناب ایم۔ عرفان صاحب، مدیر شعلۂ حیات صدر
۲۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب ایم۔ اے نائب صدر
۳۔ جناب احمد نصیر انصاری صاحب نائب صدر
۴۔ جناب رفیق محمد خاں صاحب میونسپل کونسلر خازن
۵۔ پروفیسر حسن مسعود ہاشمی صاحب ایم۔ اے جنرل سکریٹری
۶۔ مولانا احمد سعید صاحب ندوی سکریٹری

دیگر اراکین مجلس عاملہ

۱۔ مسٹر اے۔ آر۔ رشدی مدیر انگار ۲۔ مسٹر اظہر راہی ایم۔ اے
۳۔ مسٹر وکیل بھوپالی ۴۔ مسٹر قاسم نیازی بی۔ اے
۵۔ مسٹر مقصود عرفان ۶۔ مسٹر قمر جلالی
۷۔ مسٹر ضیاء الرحمٰن خاں [illegible] ۸۔ مسٹر شعیب انصاری
۹۔ مسٹر گوہر جلالی ۱۰۔ مسٹر عنایت حسین
۱۱۔ مسٹر قیوم جاوید۔

ریاستی کونسل میں ابھی تک جو نمائندے منتخب ہوئے ہیں ان میں مسٹر شرقی عثمانی، مسٹر اظہر راہی ایم۔ اے، مسٹر اشتیاق عارف، مسٹر شریف الرحمٰن اور مسٹر وحید قریشی کے نام شامل ہیں۔

ان انتخابات کی تکمیل کے بعد مسٹر ایم عرفان صدر منتخبہ نے بتایا کہ اردو کے کاز کے لیے کام کرنا ہے، اور مسٹر ایم عرفان نے مختصر طور پر اس پروگرام کا خاکہ بھی بتایا جو ان کے پیش نظر ہے۔

(نامہ نگار)

امرتسر میں انجمن ترقی اردو کا قیام

امرتسر میں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کرنے کے لیے گزشتہ کچھ دنوں سے اردو دوستوں نے سرگرم کوشش کی۔ اور شہر میں انجمن کے ابتدائی ممبر مناسب تعداد میں بنائے گئے۔

گزشتہ روز رائے بہادر لالہ پرکاش چند مہرہ صاحب کی کوٹھی واقع مال روڈ میں ممبران انجمن کا ایک خصوصی اجلاس بغرض انتخاب منعقد ہوا۔ جس میں مندرجہ ذیل عہدیداران بہ اتفاق رائے منتخب ہوئے۔

صدر:- رائے بہادر لالہ پرکاش چند مہرہ
نائب صدر:- جناب پنا لعل رند ایڈوکیٹ
سکریٹری:- پورن سنگھ ہنر

صاحب صدر کو ورکنگ کمیٹی کے ممبر نامزد کرنے کا اختیار دیا گیا۔ جن کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔ (درج تنویر)

انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ اکولہ کا الحاق ہو گیا

انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ اکولہ کا باقاعدہ الحاق ریاستی شاخ مہاراشٹر سے ہو گیا۔ اکولہ کے اردو دوستوں سے درخواست ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ اکولہ کے ممبر بن کر اردو کے مقاصد کو تقویت پہونچائیں۔

رکن سازی کے فارم حاصل کرنے کا پتہ:-

جناب بی۔ اے شہید صاحب
سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ اکولہ
عثمان آزاد ہائی اسکول، اکولہ

(م۔ ی۔ کھتری)

انجمن ترقی اردو (ہند) مہاراشٹر کی شاخیں قائم کیجیے

اس امر سے غالباً کسی کو انکار نہ ہوگا کہ اردو کے تحفظ و بقا نیز ترویج و ترقی کے لیے اب کوئی نہایت ہی مفید اور موثر اقدام کی ضرورت ہے۔ اس لیے ہر ضلع، ہر قصبہ اور ہر گاؤں غرضکہ جہاں جہاں اردو پڑھنے لکھنے اور بولنے والے موجود ہیں انجمن ترقی اردو (ہند) کی ایک شاخ قائم ہونی چاہیے۔ مہاراشٹر کے اردو نوازوں کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ انجمن ترقی اردو (ہند) ریاستی شاخ مہاراشٹر نے اپنے علاقے میں شاخوں کی تنظیم کا کام شروع کر دیا ہے اور اب تک مندرجہ ذیل شاخیں قائم ہو چکی ہیں۔

(۱) انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ بمبئی
(۲) " " " " شاخ پونہ
(۳) " " " " شاخ اورنگ آباد
(۴) " " " " شاخ مالیگاؤں، ضلع ناسک
(۵) " " " " شاخ کنڈلواڑی، تعلقہ بلولی
(۶) " " " " شاخ دیگلور، ضلع ناندیڑ
(۷) " " " " شاخ بھیونڈی ضلع تھانہ
(۸) " " " " شاخ کلیان ضلع تھانہ
(۹) " " " " شاخ پنویل ضلع قلابہ
(۱۰) " " " " شاخ پربھنی
(۱۱) " " " " شاخ اکولہ

اس سلسلے میں ہر اردو دوست سے جو ریاست مہاراشٹر میں مقیم ہے التماس ہے کہ وہ اپنے گاؤں، اپنے قصبے، اپنے شہر اور اپنے ضلع میں انجمن کی شاخ قائم کرنے کی کوشش کرے اور اگر پہلے سے کوئی شاخ قائم ہے تو اس کو مفید و موثر اور سرگرم عمل کرے۔ اس سلسلے میں مزید معلومات کے لیے جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) ریاستی شاخ مہاراشٹر سے بہ معرفت مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ، نزد جے جے ہسپتال بمبئی نمبر ۳ سے خط و کتابت کی جا سکتی ہے۔

(م۔ ی۔ کھتری شعبۂ نشر و اشاعت، انجمن ترقی اردو (ہند) مہاراشٹر)

صدر جمہوریہ ہند کی خدمت میں ادیبوں شاعروں اور مصنفین کی جانب سے یادداشت پیش کی جائے گی

مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) کی ایما پر ریاستی شاخ مہاراشٹر نے بھی یہ فیصلہ کیا ہے کہ اردو ادیبوں، شاعروں اور مصنفین کی جانب سے صدر جمہوریہ ہند کی خدمت میں ایک یادداشت پیش کی جائے۔ اس کے لیے اضلاعی شاخوں کے عہدیداران کے علاوہ گیارہ حضرات پر مشتمل ایک ادبا کمیٹی بھی بنائی گئی ہے۔ اس کمیٹی کا کنوینر جناب محمود سروش صاحب کو مقرر کیا گیا ہے۔ ادبا کمیٹی میں جناب غازی معین الدین، جناب نثار الرحمٰن منشا، جناب شمس کنول، جناب دور آفریدی، جناب عبد الحمید پوہرے، جناب ڈاکٹر نائک، جناب حمید پٹھان، جناب شاذلی، جناب شرف الحق ایڈوکیٹ اور جناب مدن موہن کالیہ کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ کمیٹی عنقریب دستخطی مہم شروع کر دے گی۔ اضلاعی شاخوں نے اپنے علاقے میں دستخطی مہم کا آغاز کر دیا ہے۔

اس یادداشت میں کہا گیا ہے کہ ہم اردو کے مصنف، ادیب اور شاعر قومی یک جہتی، جمہوریت کے اعلیٰ مقاصد اور مشترک تہذیب کے نام پر صدر جمہوریہ سے یہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ اردو کو جو ہندوستان کی چودہ قومی زبانوں میں ہے اتر پردیش، بہار، پنجاب اور دہلی کے علاقے میں دستور کی دفعہ ۳۴۷ کی رو سے سرکاری زبان قرار دیں اور آندھرا پردیش میں جہاں اردو کو دوسری علاقائی زبان تسلیم کیا جا چکا ہے قانونی موقف عطا کرنے کی ہدایت کریں اور اردو کے چلن میں سہولتیں بہم پہونچائیں۔ آزادی کے بعد سے کئی ریاستوں میں اردو زبان کی تعلیم کا مناسب انتظام نہیں کیا گیا ہے اور اس کے استعمال میں کئی رکاوٹیں پیدا کی گئی ہیں۔ یہ طریقہ قومی مقاصد کے خلاف ہے بلکہ اس کی وجہ سے ہندوستان کی آبادی کے ایک قابل لحاظ حصہ کی شخصیت کی نشوونما پوری طرح نہیں ہو سکتی۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے اعداد ہمارے سامنے ہیں اور اگرچہ ہمارے پاس یہ کہنے کے لیے کافی وجوہ ہیں کہ اردو کے جو اعداد و شمار شائع کیے گئے ہیں وہ حقیقت کی ترجمانی نہیں کرتے۔ لیکن ان اعداد و شمار کے مطابق بھی ہندوستان میں اردو بولنے والوں کی تعداد ۲،۳۳،۲۳،۰۰۰ ہے جس میں ۷۸ لاکھ اتر پردیش اور ۴۱ لاکھ بہار میں ہیں۔ اردو زبان کا ایک شاندار ادب ہے جس میں ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں، اور دوسرے فرقوں کے لوگوں نے برابر کا حصہ لیا ہے اس کے ذریعے اعلیٰ تعلیم بھی دی جا چکی ہے اور ہندوستان کے طول و عرض میں یہ آج بھی سمجھی جاتی ہے۔ جدید ہندوستانی زبانوں کے بولنے والوں میں اس کے بولنے والے پانچویں نمبر پر ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ صدر جمہوریہ ہماری اس درخواست پر ہمدردی سے غور فرمائیں گے۔

ہمیں امید ہے کہ ہمارے ادیب ہمارے ساتھ پورا پورا تعاون کریں گے۔ جن ادیبوں کی خدمت میں ہمارے نمائندے نہ پہونچ سکیں وہ حضرات زحمت کر کے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ، نزد جے جے ہسپتال، بمبئی نمبر ۳ میں تشریف لا کر ادیبوں کی اپیل کے فارم پر دستخط کر دیں۔ اس کے لیے ہم ان کے مشکور ہوں گے۔

(م۔ ی۔ کھتری شعبۂ نشر، انجمن ترقی اردو (ہند) مہاراشٹر)

انجمن ترقی اردو شاخ اڈونی کا ایک جلسہ

مورخہ ۲۲ جولائی ۱۹۶۵ء کی شام کے ۶ بجے سری نواس لاہوٹی شریک معتمد انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش حیدرآباد کے تنظیمی دورے کے سلسلے میں ایک شاندار جلسہ انجمن ترقی اردو ہند شاخ اڈونی کے زیر اہتمام منایا گیا جس کی صدارت حضرت جی، عبدل کریم ثاقب نے فرمائی جناب منشی عبدل عظیم کی قرأت، جناب شیخ صاحب ولی کی نعت خوانی کے بعد انجمن کے نائب معتمد جناب م۔ ے عبدالباسط نے انجمن کی کارگزاریوں کی مختصر رپورٹ پیش کی۔ صدر محترم نے انجمن ترقی اردو شاخ اڈونی کے خدمات کو سراہتے ہوئے یہ امید ظاہر کی کہ نوجوان طبقہ میں اردو زبان کے لیے ایسا جوش اور جذبہ رہا تو اردو زبان کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ صدر کی ابتدائی تقریر کے بعد جناب عبدالرؤف خاں صاحب نے مہمان خصوصی جناب سری نواس لاہوٹی کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ آپ ان اہم شخصیتوں میں سے ہیں جنھوں نے اردو کے لیے اپنا سب کچھ تیاگ کر دیا۔ ایسے ہی قابل شخصیتوں کی رہنمائی میں ہم اپنے بلند منزل مقصد کو پا سکتے ہیں۔

جناب سری نواس لاہوٹی نے اپنی بصیرت افروز تقریر میں فرمایا کہ کوئی زبان مٹ نہیں سکتی اگر اس کے بولنے اور سمجھنے والا ایک شخص بھی ہو۔ خوشی کی بات ہے کہ آج بھارت میں اردو کے بولنے والے کروڑوں کی تعداد میں ہیں اس لیے ہمیں زبان اردو کی ترقی اور اس کی بقا کے لیے پست ہمت ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ اس کی ترقی اور توسیع کے لیے عملی اقدام اٹھانے کی ضرورت ہے موصوف نے اردو کی ترقی کے لیے ہدایتیں دیتے ہوئے فرمایا کہ نعرے بازی سے یا مشاعروں سے اردو کی ترقی نہیں ہو سکے گی بلکہ ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں اردو جماعتوں کے لیے جد و جہد کرنا چاہیے۔

مہمان خصوصی کی تقریر کے بعد جناب سرمد صاحب، جناب عطا اللہ صاحب، جناب عبدل کریم رومانی، جناب عارف اللہ پاشا صاحب نے تقریریں کیں۔

جناب سرمد صاحب بی۔ اے بی ایڈ نے اپنی تقریر کے دوران فرمایا کہ اپنی مادری زبان کے سلسلہ میں ہم میں جو احساس کمتری پیدا ہو گئی ہے اس کو نکال دینا چاہیے اور اپنی زبان کی ترقی کے لیے عملی جد و جہد کرنا چاہیے۔

جناب عطا اللہ صاحب ایم۔ اے بی ایڈ نے اردو رسم خط پر بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر ہم اردو کی ترقی اور بقا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ غلط قسم کے رہبروں سے چوکنے رہیں یہ رہبروں کے لبادے میں رہزنی کرتے ہیں۔

جو یہ کہتے ہیں کہ اردو کی ترقی اس کا رسم الخط بدل کر ہی ممکن ہے وہ گویا اردو کو ختم کر دینے کے خواہش مند ہیں۔

جناب عبدالرؤف خاں صاحب ایم۔ اے بی ایڈ نے اپنی مختصر تقریر میں فرمایا کہ ہمیں حکومت سے گلا کرنے کی ضرورت نہیں اگر ہم اپنی مادری زبان کی بقا چاہتے ہیں تو دستور کے مطابق جو حقوق ملے گئے ہیں ان کے لیے آخر دم تک لڑتے رہنا چاہیے۔

عبدل کریم رومانی ایم۔ اے صدر شعبۂ اردو نے اردو کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو قومی یکجہتی کی یادگار ہے۔ اگر ہم بھارت میں قومی یکجہتی چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ اس زبان کو زندہ رکھیں کیونکہ یہ زبان ہماری مشترکہ تہذیب کا ورثہ ہے۔

جناب عارف اللہ پاشا متعلم بی اے نے اپنی تقریر میں کہا کہ اردو کی ترقی کے لیے ہمیں چاہیے کہ اسے عام فہم بنانے کی کوشش کریں کیونکہ جو زبان عوام میں مقبول ہو جاتی ہے وہ کبھی مٹ نہیں سکتی۔

جناب محمد اسمٰعیل صاحب نے انجمن کی کارگزاریوں پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ اڈونی میں اردو کی ترقی اور بقا کے لیے ہم حتی الامکان کوشش کرتے رہے ہیں۔

اس کے بعد جناب گل فروش کلیم اللہ خاں کے ہدیۂ تشکر کے بعد جلسہ رات کے ۹ بجے قومی ترانہ پر ختم ہوا۔

(عبدالباسط نائب سکریٹری انجمن ترقی اردو شاخ اڈونی)

صفحہ ۱۲ کا بقیہ

کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ ہندوستان زرعی معیشت کا یہ خاصا دلچسپ پہلو ہے کہ یہاں ترقی یافتہ اور پس ماندہ کاشتکاری، دونوں کو فروغ بیک وقت ہوا ہے۔ پس ماندہ کاشتکاری کو ترقی یافتہ کاشتکاری کے برابر لانا ترقی کے مترادف ہے۔ اس لیے ہندوستان زرعی مسئلہ کی نوعیت یہ ہے کہ ناواقف کاشتکاروں کو جدید سائنسی اصولوں سے آشنا کیا جائے۔ جو نظریاتی سے زیادہ عملی ہو۔ پنج سالہ منصوبوں نے اصلاحات کا ایک طویل سلسلہ شروع کیا ہے، جو دو حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ ایک وہ اصلاحات جو فن زراعت سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے کھیتی کا انتظام، مٹی اور پانی کا تحفظ مناسب کھادوں کی فراہمی، عمدہ بیج کی پیداوار اور وافر آب پاشی کا انتظام وغیرہ۔ دوسرے وہ اصلاحات ہیں جو زراعت کے پس منظر سے تعلق رکھتی ہے اور جو کہ کاشتکاری کے لیے مواقع فراہم کرتی ہے۔ مثلاً دیہاتی تنظیم، اصلاحات اراضی، زرعی امداد باہمی انجمنیں وغیرہ۔ اس جلد میں صرف چند مندرجہ بالا مباحث زیر بحث آئے ہیں، باقی دوسری اور تیسری جلدوں میں مذکور ہوں گے۔

یہ سلسلے تین جلدوں پر مشتمل ہوگا۔ مذکورہ کتاب اس کی پہلی جلد ہے۔ امید ہے اس کتاب کا اردو ترجمہ ہماری ایک اہم ضرورت کو پورا کرے گا۔

تبصرے

ڈاکٹر اولاد احمد صدیقی

خوش حالی کی تلاش

مترجم جلیس عابدی
ناشر نیشنل اکاڈمی، انصاری مارکیٹ، دریا گنج دہلی
صفحات ۴۰ قیمت پچاس پیسے۔

یہ کتابچہ برطانوی معاشی رسالہ اکانومسٹ کے اداریہ نویس کے قلم سے ہے۔ اس کا ترجمہ جلیس عابدی نے کیا ہے۔ جو رواں اور واضح ہے۔ آج کل ہندوستان اور چین کا مقابلہ دلچسپ بحث کا موضوع ہے۔ اس موضوع پر متعدد مضامین اور کتابیں ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں شایع ہوئی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تقابلی مطالعہ سے قطع نظر چین اور ہندوستان کے دیگر ہمسایہ ممالک کے متعلق واقعاتی مضامین کی اشاعت کی جائے۔ تاکہ ان کے بارے میں غلط فہمی اور خوش فہمی دونوں کا ازالہ ہو سکے۔ اگر اس کتابچے کے پڑھنے کے بعد چین کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کی جستجو پیدا ہو، تو یہ مضمون اپنے مقصد میں کامیاب سمجھا جائے گا۔

سرخ چین کی نمود بلحاظ عالم پر ایک زبردست تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے رہنما جو اس وقت تک برسر اقتدار ہیں بڑی زبردست جدوجہد کے بعد برسر حکومت آئے ہیں۔ ان کی کامیابی میں فوج اور اسلحہ کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس لیے ان کے نزدیک مقصد برآری کے لیے ہر حربہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ سرخ چین کی پالیسی ابتدا سے ہی جارحیت آمیز رہی ہے جو بیرونی تعلقات اور ملک کے اندر مسایل طے کرنے میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ چین کی جارحیت کے دو اسباب ہیں۔ ایک یہ ہے کہ چین کا مغرب سے تعلق کا تجربہ بہت تلخ ہے۔ دوسرے چین کی تاریخ عظیم سلطنتوں کے قیام اور زبردست طوائف الملوکی کی داستان رہی ہے۔ چینی تہذیب دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے شمار ہوتی ہے۔ اس نے چینیوں میں ایک طرح کا احساس برتری قائم کر دیا ہے، جو ان کے دوسرے ملکوں سے برتاؤ میں پوری طرح جھلکتا ہے۔

ہندوستان سے چین کے تعلقات کی کشیدگی بین الاقوامی بد معاملگی کی بہترین مثال ہے۔ سطحی طور پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان اور چین کے درمیان کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے ایک طویل جھگڑے کا آغاز کیا جا سکے۔ اس کے باوجود سن باسٹھ میں چین کا ہندوستان پر حملہ ایک تعجب کی بات ہے۔ اس کی تہہ میں چین کا قومی برتری کا احساس، ہندوستان کی بین الاقوامی شہرت اور اس کی بڑھتی ہوئی ساکھ سے خطرہ، کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ چین نے اپنی زبردست فوجی طاقت کے ذریعہ ہندوستان کی شہرت کو دھکا پہنچانا چاہا، جس میں اسے پوری طرح سے کامیابی نہیں ہوئی۔

ہندوستان اور چین کی ترقی کا مقابلہ فوج کی تعداد اور اسلحہ ہی نہیں، بلکہ معاشی ترقی اور خوش حالی ہی ہوگا۔ چین کو ہندوستان کے مقابلہ میں بعض وجوہات سے فوقیت حاصل ہے مثلاً کمیونسٹ نظام زندگی جو زندگی کے ہر شعبہ پر محیط ہے اور اس کے رہنماؤں کی زبردست قوت ارادی جو ریاست کے سارے وسایل کو پوری طرح استعمال کر سکتی ہے۔ اس کے برخلاف ہندوستان میں ایک جمہوری نظام قایم ہے جہاں مختلف مدرسہ فکر کی پوری کارفرمائی ملتی ہے جو فرد کو اجتماعیت کی بھول بھلیوں سے آگاہ رکھ سکتی ہے۔ ہندوستان اور چین دونوں ترقی کے ابتدائی منازل میں ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ مستقبل میں کون ایک صحت مند معاشرہ کی تکمیل جلد کر لیتا ہے۔

امید ہے یہ سلسلہ علاوہ چین کے ہندوستان کے دیگر ہمسایہ ممالک کے متعلق مضامین کی اشاعت پر بھی مشتمل ہوگا۔

ہند میں زراعت۔ جلد اوّل

شایع کردہ انڈین اکیڈمی، نرندر پلیس، نئی دہلی۔
مترجم کرنل اے۔ سی۔ اگروال۔
قیمت تین روپیہ۔

یہ کتاب انگریزی کی اسی نام کی کتاب کا ترجمہ ہے، ترجمہ سلیس اور واضح ہے۔ اور مترجم نے پوری کوشش کی ہے کہ موضوع عام فہم ہو جائے۔ یہ کتاب اعلیٰ ثانوی اسکولوں میں بطور نصاب شامل ہونے کے لیے لکھی گئی ہے۔ کوشش کی گئی ہے ہندوستان کی زراعت سے متعلق تمام بنیادی معلومات فراہم ہو جائیں۔ یہ کوشش قابل قدر ہے۔ اس لیے کہ عام فہم اور مفید کتابیں علاوہ معلومات میں اضافہ کرنے کے، ان معلومات کو عملی طور پر استعمال کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ یہ کتاب اس لحاظ سے ایک بڑی کمی کو پورا کرتی ہے۔

پنج سالہ منصوبہ بندی نے ملک کی معیشت کی تشکیل کا کام شروع کیا ہے۔ اس کی کامیابی کا دارومدار پیداوار کے بڑھنے پر منحصر ہے، پیداوار میں اضافہ جدید سائنسی ڈھنگ پر کاشتکاری

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

مالک انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپا پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شایع کی